

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## اشارات

پنڈت جواہر لال کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جس کی گہرائیوں تک ان سے پہلے کے ہندوستانی سیاست دانوں کی نظر نہ پہنچی تھی، یا اگر پہنچی تھی ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ان نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے اور پھر انہی پر اس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔

میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کر دوں گا، تاکہ اس پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض کرتے ہیں۔ تاریخ یورپ اور بیسیات یورپ کے مطالعہ سے ان کے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک جغرافیائی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اس کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدہ کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی

حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے، ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے اور اس اشتراک ہی نے ان کے اندر یہ سہم آہنگی اور یکجہانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس، رشتہ، وطنیت کا اشتراک ہے اور اسی طرح سے ہر خاک و وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔

یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔

”ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے

اندراک ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، بہم ہے اور تغیر میں ہے۔ اب سیاسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل نعو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطہ نظر سے یہ بہت دوڑ کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جاسکتا ہے۔..... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نثر نمانہ پائے۔“ (میری کہانی، جلد دوم، صفحہ ۳۳۱۔ مکتبہ جامعہ مدنی ا۔)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے

مکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا تصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ وہ نیشنلزم اور قومیت کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس کے فرقے ہیں۔ اس لیے وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو ”فرقہ وارانہ“ مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ایک بد قسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے، مگر یہ

حقیقت اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں، بلکہ تمام ”قوم پرست“ ان کے شریک حال ہیں۔

تصور قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف پر حاوی ہے، وہ کارل مارکس کا فلسفہ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں مختصر یہ ہے کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابل توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اس کے نزدیک جو اہر لال نہرو کے الفاظ میں ”دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے“ (صفحہ ۴۵۷) اگرچہ پنڈت جی بقول خود کسی اذعان فی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں ہیں، مگر مارکس کی اس تعبیر تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے، اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ ”اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا۔“ (صفحہ ۱۴۱)۔

اپنے تصور قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیاد ہی پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی، یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جن کے پاس ایک روٹی ہو وہ ایک گروہ ہوں، اور جن کے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وہلم مجرا۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں۔ بلکہ ”اگر“ کیا معنی، ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے۔  
 ”معاشری نقطہ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توہ  
 کہا جا سکتا ہے۔“ (ص ۳۳۱)۔

” ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں  
 اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیقاً نوسخی خیال کی گنجائش نہیں ہے  
 آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے۔“ (جو اہر لال کا خطبہ صدر  
 آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۲۶ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم  
 کے درمیان فرقے اور گروہ بندی کی وجہ محض معاشری اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو مسلم اور دوسرے فرقے  
 کہاں سے پیدا ہو گئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ غیر معاشری چیزوں نے ہندوؤں کو ایک ”فرقہ“ اور مسلمانوں کو  
 دوسرا ”فرقہ“ بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشری وجوہ سے اختلافات پیدا کر دیے؟ یہاں توقع تھا  
 کہ پنڈت جی اس نظریہ پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی ”وحی“ سے اخذ کیا ہے، اور اذعاناً عقیدے  
 کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے  
 تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو نہیں ہے، صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اس کی  
 ذہنیت اور اس کے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشری عامل (Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے  
 جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر  
 انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے — عقلی و استدلالی نہیں بلکہ رجحانی و وجدانی  
 رائے — قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غلط فطری چیز ہے، اور اس مادہ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز

ہو کر ہندوستانی قوم کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے ایک غلط بنیاد (یعنی طرز خیال اور طریق زندگی کی بنیاد) پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیر اثر وہ جگہ جگہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:

”جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھو کہ میرا دل بہت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹانے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یقین اور ترقی دہائی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا قائم شدہ حقوق اور عقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حمایتی ہے“ (ص ۱۶۱)۔

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار ”ہندوستانی قوم“ کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کیا تھا کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا لیک طول عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس موقع پر جہاں ہندو اور مسلم کا نام آتا ہے، چن چن ہو کر کہتے ہیں کہ ”مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو“۔ اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لا کر ایک قابل لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی ”قوم“ میں فرقہ واریت کے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیرلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے! یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات باسانی

ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور حمیدہ تر پلاتے ہیں جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، تو اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھ کر اپنے ذاتی مفاد اور برطانی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کے ساتھ حل کرنے سے سناخار کرتے ہیں، اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس نظر سے اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں صحیح راستہ صاف نظر آ جاتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریز حکومت کیساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال بیٹھے کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے اس بنا پر وہ جگہ جگہ فرقہ وارانہ ”مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں

”ان کلائونگریزوں کا تربیب کا پتہ فرقہ دارانہ مسئلہ تھا اور اسے انہوں نے خوب کھیلنا“

”فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہیں ہے“ (ص ۲۳)

”اغراض کے اس مجموعہ میں... برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغاخان کے حصہ میں آتی تھی“ (ص ۲۱)

”اصل وقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور

فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی“ (ص ۲۴)

”حکومت روز بروز معاشرتی غرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

اس کا ایل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رحبت پسند جماعتوں سے رہتا ہے جو  
 جول اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں  
 آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے مافی تہائی فرقہ پرست مذہبی رحبت پسند اور  
 اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی معاشی اور  
 سماجی اعتبار سے انتہائی رحبت پسند ہیں۔ ہندو مذہب سے ان سے کچھ کم نہیں (ص ۱۵)  
 ”فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور  
 انگلستان میں سب سے زیادہ رحبت پسند لوگ کہے جاسکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی  
 اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے عمل مطالبات میں سے  
 ایک بھی عوام اناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے“ (ص ۱۳)۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے انداز فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا انداز  
 فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیعوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ  
 وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ  
 سے ان مکار طبیعوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے،  
 اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنے کی زحمت کون اٹھائے۔ اس کا علاج بس یہی ہے  
 کہ مرض کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان  
 رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ اب ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے ”ہندوستانی قوم کو  
 فزوں میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کے لیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دار زمیندار

اور تمام مستقل اغراض رکھنے والے طبقے سامراج کے ساتھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لہذا مذہب اور سامراج، اور یہ خود غرض طبقے، تینوں باہم جڑی رشتہ دار ہیں، تینوں قابل نفرت ہیں، اور تینوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں۔

دو منظم مذہب بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ . . . . جس ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے" (ص ۶۸-۱۶۷)۔

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا شورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدر دان ہے اور بڑی بے قصبی کے ساتھ قہر کم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے" (ص ۱۱۸)۔

"مذہب امن کا و عطف کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارو مدار ظلم پر ہے"۔ (ص ۳۹۴)۔

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو جنت نشان بنانے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:-

"ہر بچہ کو ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقہ سے ہونا چاہیے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک بڑی قوم کا بالکل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ مجموعہ

نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے۔ (صفحہ ۲۱۹)

”جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی، ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social revolution) کا جذبہ پیدا ہو جائے“ (صفحہ ۱۴۵)

”بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انہیں بھی راضی کر لینا چاہیے۔۔۔۔۔۔ یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبہ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دہوکہ دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنی جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھائے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔“

”دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دہمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔“ (صفحہ ۲۵۵)

”سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا

کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے  
اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی۔ لیکن  
اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہو گی۔“ ص ۷۹-۸۰

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کے لیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے۔  
قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر ”قومی“ بنائی جائے) آخری منزل  
مقصود نہیں ہے، بلکہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ  
کے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی  
مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دہمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارتگری کر کے وسیع  
پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کر کے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ  
انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح  
تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھار کھا تھا۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، مہو کے ہیں، اور اس کے ساتھ ان کے اندر  
اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں، لہذا ہندوؤں کی نسبت وہ اس اشتراکیت کی انقلاب کے لیے  
زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

”میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔“

اس لیے کہ ان کے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں  
ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی ناکہ تیزی سے قدم بڑھائیں گے  
(صفحہ ۷۹)

جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے پنڈت جی تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان ایک جماعت ہیں، یہی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہیں (کیونکہ ان کو ”مسلمانوں“ کے نام سے یاد کرنا خود ہی مذہب کی بنیاد پر ان کو ایک مستقل جماعت تسلیم کرنے کا ہم معنی ہے) اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ایک مستقل سسٹم ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ وہ ان تینوں حقیقتوں سے بے خبر نہیں ہیں۔

اب ملاحظہ ہو کہ وہ اس مذہبی جماعت کی قومیت اور اس کے مستقل سسٹم یعنی اس کی جداگانہ تہذیب کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں :-

”مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا“ (ص ۳۳۲)

”لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرتھ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرتھ کا کبھی ذکر کرتا ہو“ (ص ۳۳۲)۔

”میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے منشی پھر مسلمان، اور انہی کی طرح ہندو، فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں۔“

ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبائے زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے منچھپوں کو منوٹنا یا ترشوانا مگر ڈارہی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دہوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل، زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور منقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں شکل ہی سے فرق کیا جاسکتا ہے تعلیم یافتہ مسلمان شادھی ڈاڑھی بکتے ہیں علیگڑھ والے البتہ سرخ ترکی ٹوپی کے گردیدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا، مسلمان عورتیں ساڑھی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں)۔ (۳۳۵)

دیکھا آپ نے۔ ایک جگہ جس قوم کے مستقل اجتماعی وجود کو تسلیم کیا گیا تھا، دوسری جگہ اسکی قومیت سے قطعی انکار ہے۔ ایک جگہ جس تہذیب کی اتنی طاقت تسلیم کی گئی تھی کہ مسلم قوم کے اجتماعی نظام میں اسکی بدولت "ایک حد تک" آزادی پائی جاتی ہے، دوسری جگہ اسی تہذیب کو بانوں میں اڑایا جاتا ہے۔ اسکو ایک بے آل چیز قرار دیا جاتا ہے۔ وہ محض پرانی قوموں کی دہندگی سی یاد ہے، یا زبان، آرٹ اور موسیقی ہے، یا چند نہایت حقیر امتیازی علامات اور چند ایسی ہی دوسری چیزوں کا مجموعہ ہے جو ٹٹتی اور فنا ہوتی جا رہی ہیں لیکن یہ کہتے کہتے دفعۃً یاد آتا ہے کہ نہیں، یہ چیز تو ابھی موجود ہے۔ اس لیے پھر یوں ارشاد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانو! تم یہ کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا رہے ہیں، مٹا دیئے اور خود مسلمان قومیں اس کو چھوڑ رہی ہیں۔

”اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی

وعدت بنتی جا رہی ہے..... اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا (ط ۳۳)۔

”اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو بہیم صدمات پہنچے ہیں۔ اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تناؤوں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مروغازی ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لیے ہندوستان ۱۹۲۱ء میں اتنا لڑا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لیے جا رہے ہیں....

... مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے..... یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیاء کے لیے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے۔“ (ط ۳۳۶)۔

مطلب یہ ہے کہ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے، جس کو سب مسلمان تو میں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں بچڑھے بیٹھے ہو۔ چھوڑو اسے اور آؤ اس راستہ کی طرف جدہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کیجنت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانیں گے۔ لہذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے مسلمان کے دل میں انگریز اور اس کی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے، اور اس سے پولوں کام لیا جاتا ہے۔

”ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر کے

”مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے یا  
 بریسی حکومت“ (ص ۳۳۱)

”ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند  
 میں برطانیہ کی شیفتی حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی؟ (ص ۳۳۴)۔“

یہاں ہندوستان کے ”قومی لیڈر“ نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔  
 وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے، لہذا جو  
 ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ بریسی حکومت  
 یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس  
 قومیت اور تہذیب کے تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو، ورنہ جو کوئی یہ نام لے گا، ٹوڈی قرار دیا جائیگا۔ یہ  
 آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب ”آزادی  
 کی فوج“ میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگا دی ہے جو حریت  
 کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پھر جواہر لال کے یہ الفاظ پڑھیے کہ ”اگر مسلمانوں میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے  
 تو غالباً وہ اشرکت کی راہ میں تیزی سے قدم بڑھا سکیں گے!“

اب آپ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں پنڈت نہرو کے اُس جدید انقلابی طریقہ سے آپ کو رو  
 ہونا چاہیے جو انہوں نے ”قرقہ وارانہ مسئلے“ کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا ہے۔

پنڈت جی خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہوشمند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی  
 قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ تو قیامت

اس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کے لیے قطعی نامکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں۔ ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس تہذیب کو خیر باد کہیں جسے وہ اس گئی گزری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا تو بہت دور کی چیزیں ہیں مسلمانوں کے اس گروہ سے تو ایسا یہ خطر رہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کرے گا، اور اس غرض کے لیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہے گا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کر کے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمیوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد چونکہ متشرعین، منسلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماع کا شیرازہ دیکھ کر برہم ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کی گرفت قائم نہیں رہی ہے، اور جہالت یا مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کا شعور اسلامیت بڑی حد تک مضحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو باسانی توڑ لیا جاسکتا ہے قبل اس کے کہ مسلمانوں کا بورڈر و اٹلبقہ — اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے — بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے یا زیادہ صریح الفاظ میں اس کی "شدھی" کرنی جائے۔

یہی حقیقت ہے اس پالیسی کی جس کو مسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے (Muslim mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطاب صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:-

”ہم نے عام لوگوں سے نچا ہٹا کر دتوں فرقہ وارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں دقت گنویا ہے۔ یہ طریقہ نکلے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ ادھر نچا ہٹے نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دولتوں اور قوموں کے بارے میں لٹگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو مسلمان سکھ، عیسائی، سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بیکاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کے لیے آگے بڑھیں جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نچا ہٹیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑے گا جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے۔“

کیسے معصوم کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں! ان کو سامنے رکھ کر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ دراصل شدمی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شدہ نہیں کیا اور معاشی شدہ ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدہ ہی کا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہو گئے تھے۔ اور یہ ایسی خفیہ تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علماء تک اس کی کنڈ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اس تحریک کے بانیوں نے چھوہڑپن سکام لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آ جاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کو دن سے کو دن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے۔ لہذا کسی چیز کے چھوڑنے کا کوئی

سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی ہندوستانی قوم کے فرد ہو گئے سارج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو، اور اس اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی۔ — ہے یہ بھی زہری کا گھونٹا گر دیکھیے، کیسے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیر مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

مجھے یہ الزام دینے میں جلدی نہ کیجئے کہ تو ایک شخص کے خیالات کو نقل کر کے ایک پوری جماعت کو بدنام کرنا چاہتا ہے نہیں اب یہ ایک شخص کے انفرادی خیالات نہیں رہے، بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کی سرکاری پالیسی بن گئے ہیں۔ آگے چل کر میں ناقابل انکار شہادتوں سے ثابت کروں گا کہ غانا کی کاپور انظام اس وقت اپنی اصولوں پر چل رہا ہے، جو پنڈت جواہر لال کی زبان سے ابھی آپ سن چکے ہیں۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق مضامین کی اشاعت کے لیے امانت کی جو درخواست کی گئی تھی اس کے سلسلہ میں مزید ڈیڑھ سو روپیہ حالی اور ڈیڑھ سو روپیہ کلدار وصول ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ سرمایہ پانچ سو پچاس روپیہ حالی اور دو سو روپیہ کلدار تک پہنچ گیا ہے۔

ان صفحات میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان کا مجموعہ ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے جو سرت دست صرف دس ہزار طبع بگا قیمت پانچ پیسے فی نسخہ رکھی گئی ہے یعنی ہر سنکڑا۔ جو حضرات اس مضمون کی اشاعت میں حصہ لینا چاہیں وہ حسب ذیل پتہ پر مراسلت فرمائیں:۔

ہتھم پنڈت "ہتھم پنڈت"  
ڈاکخانہ جال پور۔ براہ پٹھان کوٹ (پنجاب)